

کیا معذوری ایک روگ ہے؟

تدویر.....

مصنف اجمل بیگے ناز۔ لاہور

گردش حالات بعض اوقات انسان کو کسی ایسے حادثے سے دوچار کر دیتی ہے جس کے اثرات قبول کرنے کیلئے وہ ذہنی طور پر بالکل آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ اس ناگہان تبدیلی کو اس درجے تک محسوس کرتا ہے کہ اس کے اثرات سے بعد میں اس کی بحالی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا خوش قسمت انسان ہوگا جسے کبھی کسی ناخوشگوار واقعہ سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ ان منفی اثرات سے عام طور پر غیر دانستہ طور پر واسطہ پڑتا ہے اور ان کا اثر نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے بہت سے منفی واقعات کا ایک تکلیف دہ پہلو ”معذوری“ بھی ہے جس کی مختلف حالتیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ معذوری کے نتیجے میں انسان کی شخصیت پر جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ معذوری کو مجموعی لحاظ سے ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

(1) ذہنی معذوری (2) جسمانی معذوری

ان دو اقسام کی بہت سی ذیلی اقسام ہیں جنہیں شناخت کی غرض سے الگ الگ ناموں اور درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے مگر یہاں ہم مجموعی طور پر معذوری اور بالخصوص جسمانی معذوری کے اثرات کا جائزہ لیں گے اور اس کے نفسیاتی پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کریں گے۔

جسمانی معذوری کی وجوہات پیدائشی اور حادثاتی دونوں ہو سکتی ہیں۔ بچوں میں جسمانی معذوری عموماً پیدائشی ہوتی ہے جس کے اثرات کو بالکل شروع ہی میں مسلسل اور مختاط علاج سے کافی حد تک ختم کیا جاسکتا ہے۔ مخصوص ورزشیں، بجلی کے طریقہ علاج، خاص قسم کے امدادی سامان اور بعض حالتوں میں سرجری پیدائشی معذوری کو ختم کرنے میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ چھوٹی عمر میں جسمانی معذوری سے نجات پانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ بچے کے جسمانی اعضاء بچپن میں نرم اور لچکدار ہوتے ہیں اور مضبوط بن جانے سے پہلے انہیں خاص طریقوں سے بحال کیا جاسکتا ہے۔ جو بچوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے جسمانی اعضاء اپنی اپنی جگہ مکمل اور سخت ہو جاتے ہیں جنہیں بعد میں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا قدرے مشکل ہوتا ہے اور اس میں مکمل بحالی کے امکانات کا تناسب بھی کم ہو جاتا ہے۔

بچپن میں معذور بچے کی جو مشکلات ہوتی ہیں ان کا احاطہ محض تصوراتی طور پر نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ ظاہر ہے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے معذور بچے معمول کی زندگی بسر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو بچپن کے معمولات میں حصہ لے سکتے ہیں، نہ انہیں صحیح تعلیم و تربیت ہی میسر آتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ والدین کی عدم دلچسپی کا بھی شکار ہوتے ہیں۔ ہر معذور بنیادی طور پر حساس اور نفسیاتی مریض ہوتا ہے۔ اس میں یہ غیر معمولی حساس پن نازل زندگی سے محروم رہنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو بعد میں اس کے ارد گرد کے منفی ماحول سے مزید شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ کسی معذور کے ساتھ اس وقت تک تعمیری رابطہ بحال نہیں رکھا جاسکتا جب تک کہ اس کی نفسیاتی کیفیت کو کسی حد تک سمجھا نہ جائے۔ معذور بچہ بھی چونکہ ایک نفسیاتی مریض ہوتا ہے اور چونکہ وہ عام بچوں کی طرح نازل نہیں ہوتا اس لئے اس کی نفسیات بھی عام بچوں سے قدرے مختلف ہوتی ہے جن کو جانے بغیر ہم ایسے بچوں کی صحیح خطوط پر پرورش نہیں کر سکتے۔ معذور بچوں کی نفسیات سے یہی لاعلمی دراصل ان میں احساس کمتری پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ بچہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ اس کا وہم بھی ہو سکتا ہے جو عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر بچہ چونکہ اپنی مخصوص نفسیات کے خول میں بند ہوتا ہے اس لئے اس کی یہ سوچ بھی فطری ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں والدین کو بچے پر اپنا اعتماد بحال کرنے کی ضرورت ہوتی

ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ بچے کو یقین دلائیں کہ وہ اب بھی ان کیلئے اتنا ہی اہم اور پیارا ہے جتنا کہ نازل حالت میں ہوتا۔

بچے میں اپنی معذوری کا احساس عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے احساسِ کمتری اور محرومی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اوائل عمر میں بچہ اپنی معذوری کو صرف وقتی طور پر محسوس کرتا ہے اور اس کے دیرپا اثرات کی سنگینی کا اسے اندازہ نہیں ہوتا۔ محض بچہ ہی کیا خود والدین بھی شروع میں اس سنگینی کا ادراک نہیں رکھتے۔ معذور بچوں کی بحالی کا بہترین زمانہ ان کا بچپن ہوتا ہے جبکہ مختلف طریقہ ہائے علاج سے ان کی معذوری کا تدارک ممکن ہو سکتا ہے یا اس کی شدت میں کمی کی جاسکتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ معذور بچوں کی جسمانی بحالی کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہوتی ہے کیونکہ اگر ذہن کی صحیح خطوط پر تربیت نہیں کی جائے گی تو جسمانی بحالی کے باوجود پیدا شدہ نفسیاتی الجھنوں کو ختم نہیں کیا جاسکے گا۔ بحالی کے باوجود بھی معذوری اپنا کوئی نہ کوئی اثر ضرور چھوڑ جاتی ہے اور یہ اثرات جسمانی اور نفسیاتی دونوں طرح سے ہو سکتے ہیں۔ زمانہء محرومی میں بچہ جو بے توجہی محسوس کرتا ہے وہ اس کے ذہن میں اس طرح نقش ہو جاتی ہے کہ صحت یابی کے بعد بھی اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ اس لئے بچوں کی ذہنی تربیت زیادہ ضروری ہوتی ہے تاکہ وہ منفی رجحانات کو کم سے کم محسوس کریں۔ یہاں یہ بات اہم سمجھی جانی چاہئے کہ اگر معذور بچے کی ذہنی پرداختِ تعمیری انداز میں کی گئی ہو تو معذوری ختم نہ ہو سکنے کی صورت میں وہ اتنی جرات اور حوصلے کا مالک ہوتا ہے کہ اپنی معذوری سے کامیاب سمجھوتہ کر لے۔ معذوری کی ہر صورت میں یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ بچے کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ روا رکھا جائے کہ وہ اپنی معذوری کو روگ نہ سمجھے۔ یہ ضرورت ان بچوں کیلئے اور بھی زیادہ ہوتی ہے جو علاج کے باوجود پوری طرح صحت یاب نہیں ہو پاتے اور ان میں کوئی نہ کوئی جسمانی نقص رہ جاتا ہے۔ ان کی تربیت ایسے خطوط پر ہونی چاہئے کہ وہ معذوری کے باوجود خود کو کارآمد سمجھیں۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا سلیقہ اور راہنمائی مہیا کی جانی چاہئے تاکہ وہ بڑے ہو کر معاشرے کیلئے مسئلہ بننے کی بجائے مفید شہری بن سکیں۔ صرف وہی بچے بڑے ہو کر کچھ کرنے یا بننے کی جدوجہد میں کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی معذوری کو روگ نہیں سمجھتے بلکہ خود کو اس احساس سے محفوظ رکھتے ہوئے خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں کیونکہ یہی خود اعتمادی انہیں بڑے ہو کر کارآمد بننے میں مدد دے سکتی ہے۔

حادثاتی معذوری میں مجموعی طور پر بالغ افراد کا تناسب زیادہ ہے۔ یوں تو معذور بچوں کی تعداد بھی ہمارے ملک میں خاصی زیادہ ہے مگر بالغ معذوروں کی تعداد بھی اتنی کم نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اس تعداد میں اگر ان بچوں کی تعداد بھی شامل کر لی جائے جو اب بالغ ہو چکے ہیں تو تناسب خاصا بڑھ جاتا ہے۔ بالغ معذور بچوں پر معاشرے کیلئے چیلنج ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جنہیں خاص تربیت دے کر اپنے وسائل خود پیدا کرنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ یوں تو بالغ معذوروں کے جسمانی نقص ان کیلئے بیشتر مسائل پیدا کرتے ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ ان کے جذباتی مسائل بھی اس قدر ہوتے ہیں کہ ان کی حقیقت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے جذباتی تقاضے عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے رہتے ہیں اور محرومی کی صورت میں ان کے ذہنی انتشار میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرتی بے توجہی ان میں احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی پیدا کر دیتی ہے اور وہ خود کو بیکار سمجھ کر دنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ یہ کنارہ کشی رفتہ رفتہ انہیں ایک ایسے خول میں بند کر دیتی ہے جس سے وہ باہر نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرنا چاہتے۔ وہ اپنے آپ کو فضول، بے مصرف اور فالتو سمجھ کر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتے رہتے ہیں اور معذوری کو تمام حالات کا ذمہ دار ٹھہرانے کے سوا انہیں کوئی حل نہیں سوچتا۔ وہ اپنی معذوری کو روگ سمجھتے ہیں اور اس طرح اپنی ذہنی کچھی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر لیتے ہیں۔

آئیے! اس بات کا جائزہ لیں کہ وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ مشاہدات بتاتے ہیں کہ ان کی یہ انحطاطی سوچ زیادہ تر ”معاشرتی عدم توجہی“ کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ معاشرے میں ان کی اہمیت اور وجود کو تسلیم نہیں کیا جاتا، نازل لوگوں کو ان پر ترجیح دی جاتی ہے اور عام طور پر انہیں بیکار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ معذور افراد کی اس سوچ میں ان کے ذاتی ماحول اور گھریلو افراد کے برتاؤ کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے مگر مجموعی طور پر اس منفی رجحان کا ذمہ دار وہ معاشرہ ہی ہوتا ہے جو انہیں نظر انداز کرتا ہے اور انہیں وہ مقام نہیں دیتا جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں بلکہ اس کی بجائے ہر نازل انسان انہیں ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ان پر ترس کھاتا اور انہیں بیچارہ سمجھتا ہے۔ یہ ہمدردی اور ترس اصل میں ان کے احساسِ کمتری میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان کا وجود واقعی قابلِ رحم ہے۔ اس طرح معاشرے کی بظاہر یہ ہمدردی معذوروں کی ذہنی پسماندگی کا باعث بنتی ہے اور ان کے مسائل سلجھنے کی بجائے نفسیاتی طور پر مزید الجھتے جاتے ہیں اور وہ خود کو بچ بچ معاشرے پر بوجھ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا معذوری واقعی روگ ہے؟ اس کے جواب میں مجموعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ معذوری روگ نہیں ہوتی بلکہ اسے روگ بنا لیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے میں زیادہ تر وہی افراد ہوتے ہیں جو اپنی معذوری کو ایک خدائی ظلم سمجھتے ہیں۔ دراصل ان میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے۔ وہ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ خدا نے انہیں جو صلاحیتیں دے رکھی ہیں ان کے استعمال کا بہترین وقت یہی ہے۔ معذوری محض ایک ”عذر“ ہوتا ہے جو انسان سے سبھی کچھ نہیں چھین لیتا۔ اگر غور کیا جائے تو خدا چلنے پھرنے کی صلاحیت چھین کر اس کے بدلے میں کچھ نہ کچھ ضرور عنایت کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک غیر دانستہ سودے بازی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بدلے میں ملنے والی صلاحیت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اس کا استعمال نہ کیا جائے یا سرے سے یہ محسوس ہی نہ کیا جائے کہ ہمیں ملا کیا ہے۔ ہم نے کئی ایک جسمانی معذوروں کو محیر العقول کام کرتا دیکھا، پڑھا یا سنا ہوگا۔ ایک ٹانگ سے سائیکل چلانا، دونوں ہاتھوں سے محرومی کی صورت میں پاؤں سے قلم پکڑ کر لکھنا، پیروں کی مدد سے کھانا کھانا، کپڑے دھونا اور دوسرے حیرت انگیز کام کرنا وغیرہ۔ ذرا سوچئے کیا کوئی نارمل انسان پیروں کی مدد سے لکھنے یا کھانا کھانے کا عملی مظاہرہ کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ صلاحیت متاثرین کو لین دین کے اس الہامی سودے کے تحت حاصل ہوتی ہے جس کی رُو سے خدا انہیں کسی ایک عضو سے محروم کر کے دوسرے عضو میں اتنی غیر معمولی صلاحیت بھردیتا ہے جس کے استعمال سے وہ اپنے معمولات زندگی از خود انجام دینے کے قابل رہتے ہیں مگر اس غیر معمولی طاقت کا بروقت ادراک حاصل کرنا شرط اول ہے۔

معذوری کے باوجود خود کو کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہم بیکار محض نہیں ہیں بلکہ بہت کچھ ایسا کر سکتے ہیں جو نارمل لوگوں کے بھی بس میں نہیں۔ دوسرے خود میں یہ خودداری پیدا کی جائے کہ ہم جہاں تک ممکن ہو، دوسروں کے محتاج نہیں رہیں گے۔ یہ مثبت سوچیں ان میں خود اعتمادی پیدا کریں گی جس سے نہ صرف انہیں تقویت ملے گی بلکہ وہ ذہنی طور پر اپنی حیثیت کو ثابت کرنے کیلئے عملی کوششیں کر سکیں گے۔ معذور لوگوں کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ وہ فطرت کے اصولوں سے بغاوت یا راہ فرار اختیار نہیں کر سکتے، اس لئے انہیں اپنی حالت پر آنسو بہانے یا خدا سے شکوہ کرتے رہنے کی بجائے ذہنی طور پر اپنی معذوری کو قبول کر لینا چاہئے۔ جو چیز امنٹ نقوش کی طرح ان کی زندگی میں شامل ہوگئی ہے اسے بروقت تسلیم کر لینا ہی دانشمندی ہے، اس کے بعد ہی وہ پوری توانائی سے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اپنی معذوری کو روگ بنا کر بیٹھے رہنا دراصل کچھ نہ کرنے کا بہانہ ہوتا ہے۔ معذور لوگ اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں نہ لاکر انہیں ضائع کرتے ہیں اور یوں اپنی زندگی سے انتقام لینے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اس کا روانی میں انہیں ناکامی اور وقت کی بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے ہی افراد دوسروں کی ہمدردیاں سمیٹتے پھرتے ہیں اور نتیجتاً خود کو ایک ایسا بیکار وجود بنا لیتے ہیں جو جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے بیکار ہوتا ہے..... اپنے لئے بھی اور ملک قوم کیلئے بھی۔

معذوروں کو چاہئے کہ وہ پہلے خود اپنی قدر کرنا سیکھیں، اپنی خودداری کو مضبوط بنائیں اور خود کو اہم سمجھتے ہوئے ذہنی طور پر معذوری کے چیلنج کا مقابلہ کریں۔ زندگی چاہے کسی صورت میں ہو، قدرت کا ایک انمول عطیہ ہے۔ سانس کی آمد سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ معذور افراد جب تک خود اپنی وقعت نہیں سمجھیں گے، معاشرے میں ان کی حیثیت تسلیم نہیں ہو سکے گی۔ معذوری ایک روگ یا لعنت ہرگز نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی صلاحیتوں کو صحیح خطوط پر استعمال کریں تو معذوری کے اثرات کو کم سے کم کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کئی ایسے مثالی معذور موجود ہیں جو اپنی اہمیت جانتے ہیں، جو معذور ہونے کے باوجود خود کو اہم سمجھتے ہیں، جو نہیں سمجھتے کہ معذوری ان کی صلاحیتیں ضائع کر رہی ہے بلکہ اکثر حالتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ معذوری چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ معذور افراد کو اس احساس کا شکار نہیں ہونا چاہئے کہ وہ معاشرے پر بوجھ ہیں بلکہ انہیں پر اعتمادی سے یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ان میں کوئی ایک ایسی صلاحیت ضرور ہے جو دوسروں میں نہیں۔ انہیں کسی طرح بھی یہ نہ سوچنا چاہئے کہ معذوری کی وجہ سے وہ تیسرے درجے کے فرد ہو گئے ہیں یا ان کے حقوق نارمل لوگوں سے کم ہیں۔ انہیں چاہئے کہ لوگوں سے ہمدردی کی توقع رکھنے کی بجائے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں اور معاشرے میں اپنی ایک ایسی منفرد حیثیت قائم کرنے کی کوشش کریں جو نہ صرف ان کی پہچان بن جائے بلکہ دوسروں کیلئے مثال اور مشعل راہ بھی ہو۔

معذور افراد کو جہاں اپنی وقعت اور اہمیت کا اندازہ کر کے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے وہاں عام صحت مند لوگوں پر بھی بہت سے اخلاقی اور معاشرتی فرائض عائد ہوتے ہیں۔ نارمل لوگوں کو چاہئے کہ وہ جسمانی طور پر معذور افراد کو معاشرے کا اٹوٹ حصہ سمجھیں۔ اُن کی یہ سوچ غیر انسانی ہوگی اگر وہ معذوروں کو خود سے کمتر یا گھٹیا سمجھیں۔ نارمل لوگوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ معذوروں کی موجودگی ہی انہیں اپنے نارمل ہونے کا احساس دلاتی ہے لہذا انہیں معذوروں کو اپنے لئے لازم و ملزوم سمجھنا چاہئے۔ انہیں خدا کا شکر بجالانا چاہئے کہ وہ نارمل زندگی بسر کر رہے ہیں اور اسی نارمل زندگی کے شکرانے کے طور پر انہیں معذوروں کے ساتھ خوش اخلاقی اور بھائی چارے سے

پیش آنا چاہئے اور ان سے محتاط انداز میں گفتگو کرنی چاہئے تاکہ ان کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ انہیں معذوروں کو یہ یقین دلانا چاہئے کہ معاشرے میں ان کا وہی مقام ہے جو معذوری سے پہلے تھا۔ معذور افراد عموماً اس لئے اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں کہ معاشرے میں ان کو جسمانی اور جذباتی طور پر قبول نہیں کیا جاتا۔ تعلیمی اور ملازمتی اداروں میں ان کو جگہ دینے میں لیت و لعل سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو نارمل لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ پبلک مقامات تک ان کی رسائی تعمیراتی رکاوٹوں کے باعث ممکن نہیں ہوتی۔ معذور افراد کی یہ مایوسی معاشرے اور حکومت کیلئے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے جس کے تذکرہ کیلئے ہمیں مہذب قوموں کی طرح ٹھوس منصوبہ بندی کر کے معذوروں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے اور اپنا احساسِ محرومی کم کرنے میں مدد دینی چاہئے۔ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ معذوروں کی بحالی کیلئے حتی الامکان عملی اقدامات کرے۔ ان کی معاشرتی حیثیت کو تسلیم کیا جائے، انھیں ایسی ٹریننگ دی جائے جس کو روئے کار لا کر وہ خود کفالت کی راہ پر گامزن ہو سکیں اور ملک و قوم پر بوجھ بننے کی بجائے اپنی روٹی خود کمانے کے قابل ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی بحالی کیلئے جہاں ضروری ہو بیساکھی اور مصنوعی اعضاء سے لیکر وہیل چیئر تک انھیں بلا معاوضہ فراہم کرے۔ عوام کو چاہئے کہ وہ معذوروں سے رابطہ کرتے وقت ان بنیادی نکات کا بطور خاص خیال رکھیں اور اپنے ذمہ دار ہونے کا ثبوت دیں:-

✿ جسمانی طور پر معذور انسان سے ہمدردی کیجئے مگر اس کے سامنے ہمدردی جتائیے نہیں کیونکہ اس سے اس کی خود اعتمادی متاثر ہوتی ہے۔

✿ جو انسان کسی معذور کو پچارہ سمجھ کر اس پر ترس کھاتا ہے وہ دراصل ہمدردی کی آڑ میں اس کی ہمت توڑنے کا مرتکب ہوتا ہے۔

✿ جسمانی معذوروں پر ترس نہ کھائیے، اس سے نہ صرف ان کی انا کو ٹھیس لگتی ہے بلکہ ان کی حوصلہ شکنی بھی ہوتی ہے۔

✿ معذور افراد نارمل لوگوں سے کہیں زیادہ حساس ہوتے ہیں اس لئے ان کے احساسات کو اپنے ذمہ معنی جملوں سے ٹھیس نہ پہنچائیے۔

✿ معذور افراد کی بہترین حوصلہ افزائی یہ ہے کہ اپنی بحالی کیلئے وہ جو کوششیں کر رہے ہیں انہیں خلوص دل سے سراہا جائے۔



یہ مقالہ عالمی سال برائے معذوراں 1981ء کے موقع پر لکھا گیا اور دسمبر 1981ء میں فلیمینز ہوٹل لاہور میں منعقدہ ایک سیمینار میں پڑھا گیا۔ اسی شام یہ ریڈیو پاکستان لاہور کی چینل ٹو پر نشر ہوا۔ بعد میں یہ مقالہ ”روز نامہ جنگ کراچی“، ”چندرہ روزہ ”دیہی رضا کار“ لاہور اور ”ماہنامہ سکھی گھر لاہور“ کے علاوہ دیگر بہت سے جراندور رسائل میں شائع ہوا اور بے حد پسند کیا گیا۔ اسی مقالے کی بنیاد پر مصنف کو سیمینار کے اختتام پر ایک جوہر شناس خاتون نے ملازمت کی پیشکش کی جو قبول کر لی گئی اور موصوف نے 18 سال تک ان کے ادارے میں کام کیا۔ اس مضمون کی اہمیت اور افادیت 26 سال کے بعد بھی روز اول کی طرح مسلم ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر یہ مضمون افادہ عام کیلئے مصنف نے خصوصی طور پر اس رسالے..... وائس آف اسپیشلز لاہور..... کیلئے عنایت کیا ہے جس کیلئے ادارہ ان کا مشکور ہے۔